پاکستانی اُردو افسانے میں 'ترکِ سکونت' کے تجربے کا اظہار

عذرا پروین*

ڈاکٹر عقیلہ بشیر**

Abstract:

Although the political, social and cultural history of Pakistan has been an important topic in Pakistan Urdu short stories yet such issues of Pakistani immigrants in multi-cultural societies are not entertained in Urdu research and criticism. The following article presents a comprehensive view of the topic mention above.

ترکِ وطن کی اصطلاح اپنے مستعمل معنوں میں اُن لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو اپنی جنم بھومی سے دُور دنیا کے مختلف ممالک میں جز وقتی یا کُل وقتی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کسی خاص اصطلاحی یا مستعمل معنوں سے قطع نظر اس مرکب اصطلاح کا سادہ اور لغوی مطلب سامنے رکھا جائے تو وہ ہے ''وطن کو چھوڑ دینا۔''

وطن کو چھوڑ دینے کا عمل مزید کئی صورتوں اور توجیحات کو سامنے لاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری عمومی زندگی میں ہی نہیں بلکہ مستند لغات میں بھی وطن چھوڑنے کے اس عمل کے لیے کئی الفاظ مرکبات مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً جلاوطنی، ہجرت، نقل مکانی، دیس نکالا وغیرہ

قیامِ پاکستان سے اب تک لاکھوں افراد نے دنیا کے مختلف ممالک میں سکونت اختیار کی۔ یہ سکونت کہیں عارضی بنیادوں پر اختیار کی گئی تو کہیں مستقل صورت اختیار کر گئی اور تارکینِ وطن نے مختلف ممالک (خصوصاً ترقی یافتہ) کی شہریت بھی حاصل کی۔ عمومی طور پر اِن تارکینِ وطن میں سے زیادہ تر عارضی طور پر مختلف ممالک میں گئے اور پھر چاہنے کے باوجود خود کو مستقل واپس پاکستان لانے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکے۔ تارکینِ وطن کی انہی مجبوریوں، تذبذب اور مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے رؤف کلاسرہ نے لکھا:

''کچھ کے گھروں پر رشتہ دار قبضہ کر لیتے ہیں تو کسی گھر کا کرایہ دار مالک بن جاتا ہے۔

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** صدر نشین شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

یہ لوگ دھرتی کی محبت میں دھوکے کھاتے رہتے ہیں۔ سب کو علم ہے وہ اپنی اولاد کو واپس نہیں لے جاسکتے۔ اُن کے بچوں کا امریکہ میں حاصل کیا گیا جدید علم اور نئی ٹیکنالوجی اپنے ملک کے کام کبھی نہیں آئے گی۔ یہ سب یہیں دل جلاتے رہیں گے۔''(۱)

رؤف کلاسرہ نے یہاں جس تذبذب، مجبوریوں اور خواہشات کا ذکر کیا ہے وہ بہت اہم ہے اور اِن تارکینِ وطن کے یہاں جہاں معاشرتی، تہذیبی یا مذہبی مسائل کو جنم دیتی ہیں وہیں کئی نفسیاتی مسائل بھی پیدا کر رہی ہیں۔

پاکستانی تارکینِ وطن کی وہ کثیر تعداد جو بیرونی دنیا میں مقیم ہے انہیں دو حصوں میں تقسیم کا جاسکتا ہے ایک وہ جو ترقی یافتہ مغربی ممالک میں جا بسے ہیں اور دوسرے وہ جو سعودی عرب یا دیگر خلیجی ممالک میں مقیم ہیں۔

اِن تارکینِ وطن کے یہاں ترکِ سکونت کے اسباب ۴۷ء یا ۷۱ء کے مہاجرین سے بہت مختلف ہیں۔ پاکستان کا شمار دنیا کے اُن بظاہر ترقی پذیر مگر پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے جہاں آج تک معاشی یا سیاسی استحکام پیدا نہیں ہوسکا۔ آج بھی یہاں کی کثیر آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ آج بھی لوگوں کو بہتر علمی یا طبی سہولیات میسر نہیں ہیں۔ پاکستانی معاشرہ طبقاتی تقسیم کا شکار ہے اور جہاں ایک طرف سرمایہ دار اور مزدور کا تعلق بحث طلب ہے وہیں دوسری طرف جاگیردارانہ سماج نے جس ظلم اور ناانصافی کو جنم دے رکھا ہے وہ اپنی جگہ ایک الگ باب کا متقاضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بے شمار لوگ معاشی آسودگی اور اپنے کنبے کی بیشتر معاشی کفالت کی غرض سے دیگر ممالک کا رُخ کرتے رہتے ہیں۔ روزگار کی تلاش میں ترکِ سکونت اختیار کرنے والوں کی بڑی تعداد سعودی عرب یا دیگر خلیجی ریاستوں کا رُخ کرتی ہے۔ اگرچہ اِس مقصد کے لیے بے شمار لوگ یورپ، امریکہ یا دیگر ترقی یافتہ ممالک بھی جا رہے ہیں تاہم ان ممالک میں جانے والوں کی اکثریت اپنے کاروبار میں وسعت، اعلیٰ تعلیم کے حصول، سرکاری وظائف یا مغرب کی آزادی کے سبب وہاں جاتی ہے اور پھر یہ تارکینِ وطن وہاں کی منظّم زندگی اور قانون کی بالادستی کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے تحفظ کے گن گاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دو طرح کے تارکین کے یہاں یہ قدر مشترک دکھائی دیتی ہے کہ وہ وطن واپسی کی خواہش رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر ایسا کرنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِن ممالک میں کیے جانے والے نسلی امتیازی سلوک اور دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت کے باوجود انہیں ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یوں ترکِ سکونت کے دو بڑے اور بنیادی اسباب کا تعین کیا جائے تو ایک معاشی آسودگی اور دوسرا ذہنی آزادی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

سعودی عرب یا خلیجی ریاستوں کا رُخ کرنے والے بیشتر تارکینِ وطن کا تعلق پاکستان کی مڈل کلاس سے ہے جو محنت مزدوری کی غرض سے وہاں گئے اور نا صرف اپنے خاندان کی معاشی کفالت کے قابل ہوئے بلکہ صاحبِ جائیداد بھی بنے۔ اِن تارکین کے اہلِ خانہ معاشی آسودگی کے سبب ہی اِن احباب کی وطن سے دُوری کو نہ صرف قبول کر لیتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو وہ پیسہ کمانے والی اس مشین کی سی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں کہ جنہیں تادیر گھروں

میں رکھنا گھر والوں کے لیے بھی بوجھ بننے لگتا ہے اور وہ اُنہیں واپس بھیجنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں تاکہ معاشی آسودگی جاری رہ سکے جس کے وہ اب عادی ہو چکے ہیں۔ یوں کنبے کے سربراہ کا دیارِ غیر میں رہنا اُن کے خاندانوں کو جہاں معاشی آسودگی فراہم کرتا ہے وہاں انہیں دیگر سماجی مسائل سے بھی دوچار کرتا ہے۔ خصوصاً اولاد کی بے راہ روی اور برس ہا برس انتظار کرنے والی بیویوں کی جذباتی زندگی کی تسکین وغیرہ وہ مسائل ہیں کہ جن کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے اور ہم عمومی طور پر اِن پر توجہ نہیں دیتے، لیکن کہانی لکھنے والا کہانی کار اِن مسائل سے غافل نہیں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اِن ممالک میں بسنے والے مذہبی یا تہذیبی سطح پر اُس تفاوت کا شکار نہیں ہوتے جس طرح مغربی اور ترقی یافتہ ممالک میں بسنے والے ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں مذہبی شدت پسندی یا آزادانہ علمی مباحث کی سازگار فضا نہ ہونے کے باعث یورپ کی آزاد معاشرت میں سکونت اختیار کرنے والے تارکینِ وطن ایک وقت تک تو اِسے باعثِ اطمینان تصور کرتے ہیں، لیکن پھر صورتِ حال پیچیدہ ہونے لگتی ہے۔ خصوصاً جب اولاد اِس معاشرت میں پل کر جوان ہوتی ہے اور اُن کی عادات واطوار یا ترجیحات اُسی معاشرے سے میل کھاتی ہیں تو پھر والدین کو فکر ستانے لگتی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے جو محبت اور نفرت کے رشتے پر استوار ہے کہ ایک طرف تو وہ مغربی چکاچوند سے متاثر ہیں جبکہ دوسری طرف اُن سے نفرت بھی کرتے ہیں اور اپنے مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کا خطرہ اُنہیں بسا اوقات شدت پسند مسلمان بھی بنانے لگتا ہے جب کہ وہاں پرورش پانے والی نسل اِس دوہرے معیارِ زندگی کی وجہ سے کئی نفسیاتی مسائل کا شکار بھی ہوئی ہے۔

ایک وقت بالخصوص ۹/۱۱ سے قبل تو اِن معاشروں میں بسنے والے تارکینِ وطن کے یہاں بڑا مسئلہ یہی تہذیبی بُعد تھا اور اولاد کی بے راہ روی، جنسی آزادی یا شادیوں ایسے مسائل ہی بڑے مسائل تھے، لیکن ۹/۱۱ کے واقعے کے بعد اِن معاشروں میں بسنے والے تارکینِ وطن کے مسائل اور رویوں میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔ اب مسائل اس درجہ سادہ نہیں رہے بلکہ بے حد پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔ تاہم اِن مسائل یا ۹/۱۱ کے نتیجے میں جنم لینے والی عالمی صورتِ حال اور نئے مباحث سے پہلے دنیائے عالم میں ہونے والی بڑی بڑی انسانی نقل مکانی کو زیرِ بحث لانا بھی ضروری ہے تاکہ ترکِ وطنیت کے مختلف اسباب اور جہتیں سامنے لانے میں آسانی ہو۔ بقول منیر احمد شیخ:

> ''سرزمینِ وطن کو چھوڑنے کا بڑا سبب جنگ، بیرونی حملے اور اندرونی خلفشار تو تھے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض افراد اور گروہوں نے ایک علاقہ چھوڑ کر دوسرے کو محض اس لیے آباد کیا کہ وہ انسانی فطرت کے اس جذبے کی تشفی کرنا چاہتے تھے جس میں خوب سے خوب تر کو دیکھنے کی خواہش مضمر ہے۔''(۲)

ترکِ سکونت یا نقل مکانی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بعض اوقات نقل مکانی کا یہ عمل پُرامن اور من چاہا جب کہ بعض اوقات پر تشدد اور جبراً ہوتا ہے۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۹۲۴ء کے دوران تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ یورپی

باشندوں نے بیرون ملک نقل مکانی کی جن میں سے ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ تو صرف امریکہ میں منتقل ہوئے۔ **(۳)**

اسی طرح بیسویں صدی کے آخر میں اس سے بھی بڑی ترکِ وطن کی مثالیں سامنے آئیں اور ۱۹۹۰ء میں قانونی بین الاقوامی تارکینِ وطن کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ تھی تو پناہ گزینوں کی ایک کروڑ ۹۰ لاکھ اور غیر قانونی تارکین کی تعداد بھی ایک کروڑ کے قریب۔

عالمی دنیا میں نقل مکانی کے انہی وسیع تجربات کا ذکر کرتے ہوئے منیر احمد شیخ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ بہت بڑی ہجرتوں کا زمانہ ہے۔ آبادی کا جتنا بڑا تبادلہ اس دوران میں ہوا اس سے پہلے کئی صدیاں دیکھنے میں نہیں آیا۔'' **(۴)**

نقل مکانی کے بعض تجربات عارضی تھے تو بعض مستقل، بیلجیئم کے مہاجرین جو جرمن حملہ آوروں کے خوف سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح اِٹلی، فرانس، رومانیہ ایسے ممالک کہ جہاں دشمن فوجیں قابض ہوئیں، کی آبادی نے بھی عارضی طور پر وطن چھوڑا اور بعدازاں وطن لوٹ آئے۔ نقل مکانی کی یہ صورت پاکستان کے اندر طالبان کے خلاف ریاستی آپریشن کے نتیجے میں جنم لینے والی اُن لاکھوں افراد کی صورت بھی دیکھی جاسکتی ہے جو ایک مرتبہ سوات تو دوسری مرتبہ شمالی وزیرستان سے ملک کے دیگر حصوں میں آئے اور حالات بہتر ہونے پر ریاستی مدد کے تحت انہیں واپس بسایا گیا۔ اسی طرح بعض مستقل نوعیت کی نقل مکانیاں بھی تھیں جیسے بلقان کی ریاستوں میں وہاں کی آدھی سے زیادہ آبادی ملک چھوڑ گئی اور بعدازاں واپسی کے لیے حکومت کی ذلت آمیز شرائط کو نہ مانتے ہوئے واپسی سے انکار کیا۔ اسی طرح ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان روس میں سفید اور سرخ فوجوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی تو تقریباً دس لاکھ روسی وہاں سے بھاگ گئے۔ بعدازاں جرمن روس پر حملہ آور ہوئے تو ۱۵ لاکھ کے قریب روسی وطن چھوڑ کر یورپ میں آباد ہوگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یونان میں ایشیائے کوچک سے ہزاروں مہاجرین کی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء کے دوران مسلسل نقل مکانی، جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت (۱۹۴۳ء) کے بعد جرمنی سے بے شمار لوگوں کی نقل مکانی کہ جن میں یہودی سب سے زیادہ تھے۔ فلسطین کے نقل مکانی کرنے والے یا ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں نقل مکانی کے بڑے تجربات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ **(۵)**

ترکِ سکونت کے حوالے سے ایک اہم پہلو یہ بھی رہا کہ جزوی طور پر استعمار کے خاتمے یا کئی ریاستوں کے قیام نے آغاز میں پُرکشش مراعات کے ذریعے ترکِ سکونت کی ترغیب دی اور لوگوں نے اِن ریاستوں کا رُخ بھی کیا، لیکن اب تارکینِ وطن کی حد سے بڑھتی ہوئی تعداد اور اثر و رسوخ نے اِن ریاستوں کو چوکنا کر دیا ہے اور یوں اب اس کی حوصلہ شکنی اور مختلف حربوں سے اِن پر قدغن کے رویے کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ بقول ہنٹنگٹن:

> ''نقل مکانی کی یہ نئی اور جزواً استعماریت کے خاتمے، نئی ریاستوں کے قیام اور اُن ریاستی پالیسیوں کا نتیجہ تھی جن کے تحت لوگوں کی ترکِ وطن کی حوصلہ افزائی کی گئی یا اُنہیں مجبور کیا گیا۔ تاہم یہ جدیدیت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا نتیجہ تھی۔ ذرائع نقل و

حرکت میں تیزی نے ترکِ وطن کو آسان اور تیز اور ارزاں بنا دیا۔ مواصلات میں بہتری نے معاشی مواقع کے حصول کے لیے ترغیبات میں اضافہ کیا۔''(۶)

ابتداً خوش دِلی سے بلائے گئے تارکینِ وطن کی بے قابو ہوتی تعداد سے جنم لینے والا یہ خوف بھی بامعنی ہے جس کی طرف ہنگٹن نے اشارہ کیا۔

''ایک سطح پر تو یہ خوف بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اب اِن پر فوج اور ٹینک نہیں تارکینِ وطن دھاوا بول رہے ہیں جو دوسری زبانیں بولتے ہیں۔ دوسرے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ڈر ہے کہ ان کے روزگار پر قابض ہو جائیں گے۔''(۷)

۹/۱۱ کے تناظر میں جنم لینے والے خدشات نے پاکستانی تارکینِ وطن کو دنیا بھر میں بے شمار مسائل سے دوچار کیا لہٰذا یہ سارے مسائل اور بدلی ہوئی زندگی کے مختلف رنگ وہاں بسنے والے اُن تخلیق کاروں کی تخلیقات میں دکھائی دینے لگے جو اُردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنا رہے تھے۔ انہی میں وہ افسانہ نگار بھی شامل ہیں کہ جنہوں نے اس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ مغرب میں خلق ہونے والا یہ افسانہ جہاں ایک طرف اُردو زبان اور پاکستانی سماج سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے لاشعور کو منعکس کر رہا ہے۔ وہیں اس میں مقامی کے ساتھ ساتھ آفاقی رنگ بھی نمایاں ہے۔ اِن افسانوں کے کردار مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے جس صورتِ حال کو جنم دے رہے ہیں وہ موضوعاتی تنوع کی حامل ہے۔ مختلف تہذیبوں کے درمیان حائل رکاوٹیں تہذیبی کشمکش (جسے ہنٹگٹن تصادم بھی کہتا ہے) کو ہی جنم نہیں دیتیں اِن کے درمیان مصالحت اور قبولیت کے رویے کو بھی پروان چڑھا رہی ہیں۔ یہ ایک عالمگیر رویہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری لکھتے ہیں:

''عالمگیریت کے اثرات مغرب کے اُردو افسانے میں بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اہلِ مغرب اور ایشیائیوں کے درمیان تہذیبی کشیدگی اپنی جگہ مگر افسانہ نگاروں نے مختلف تہذیبی پس منظر رکھنے والے افراد کو قریب لانے کے لیے قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ یہاں ہندوستانی اور پاکستانی کرداروں کی مغربی کرداروں سے دوستیاں اور شادیاں اور پھر ان شادیوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہوئی نئی نسل کے کرداروں کی اچھی خاصی چہل پہل ہے۔''(۸)

دراصل ڈاکٹر جواز جعفری کا نقطۂ نظر بھی تہذیبی ثقافت کی بجائے مصالحت اور انجذاب کے رویے کا حامل ہے۔ بیرونِ ملک مقیم افسانہ نگاروں نے امریکہ اور یورپ میں بسنے والے پاکستانی تارکینِ وطن کہ جن میں ڈاکٹر انجینئر سے لے کر مزدور طبقہ اور غیر قانونی طور پر رہنے والے تمام پناہ گزین شامل ہیں، کی روزمرہ زندگی کے معمولات، طرزِ بود باش، دُکھ سُکھ، اُداسی، احساسِ تنہائی و مایوسی، تہذیبی و ثقافتی چپقلش، مادری زبان اور مشرقی

اقدار روایات کے تحفظ کی خواہش، جنسی و ذہنی انتشار، حال و ماضی کی کشمکش، دیارِ غیر میں حصولِ معاش کی ذیل میں اُٹھائی جانے والی جانی و مالی تکلیف، والدین کا اپنی تہذیبی و ثقافتی جڑوں سے پیوستہ رہنے پر اصرار، مغربی تہذیب کی پروردہ نوجوان نسل کا والدین کی تہذیبی روایت و ثقافت سے جڑنے سے انکاری ہونا، ناسٹلجیا کی گل فشانیاں غرض ایک معاشرے سے کٹ کر دوسرے معاشرے کا حصہ بننے یا پھر وہاں آباد ہونے والے تارکینِ وطن کی تہذیبی و اخلاقی کشمکش کو مستقل موضوع بنا کر کہانیوں میں پیش کیا۔

یہاں ان افسانہ نگاروں اور اُن کی افسانوی تحریروں پر بحث کی جائے گی جنھوں نے براہِ راست خود وطن کو ترک کیا یا تارکینِ وطن کے مسائل کو بالواسطہ اور بلا واسطہ اپنی کہانیوں میں سمویا۔ اس حوالے سے پہلا معروف نام افتخار نسیم کا ہے کہ جنھیں ابتدا ہی سے اپنے متبادل جنسی رجحانات اور آزاد خیالی کی بے پایاں خواہش کے سبب پاکستانی معاشرے میں اخلاقی پابندیوں اور حد بندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابوالقول ڈاکٹر جواز جعفری:

> ''افتی ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کا فن صرف پاک و ہند کی زندگی سے متعلق تجزیوں کو دُہرانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ افسانہ آج کے مغرب کی تہذیبی زندگی کے لیے طرزِ احساس کو اُردو قارئین تک پہنچانے کا قابلِ قدر فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔''(۹)

دراصل افتخار نسیم کی کہانیاں امریکہ ایسے آزاد معاشرے میں پاکستانی تارکینِ وطن کے شب و روز کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانہ ''کنگ سائز بیڈ'' کے پروفیسر شاہد اور شکیلہ ایسی ہی مصروف و تنہا زندگی گزارنے والے کرداروں کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کی شادی کو پچیس سال ہو گئے ہیں۔ اِس دوران اُن کے ہاں دو بچے بھی پیدا ہوتے ہیں، لیکن گھر کی بے نیاز و لاتعلق فضا میں خود بخود بلوغت کی حد کو پہنچنے والے بچے باپ کو اُس کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اجنبی سمجھتے ہیں۔

> ''.....وہ چاروں ایک ہی گھر میں جانے پہچانے اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔''(۱۰)

برصغیر پاک و ہند کی فضا میں ایک خاص قسم کی کشیدگی پائی جاتی ہے جس میں تعصب، نفرت اور حسد و کینہ کی بُو ہر دو طرف بہ آسانی محسوس کی جا سکتی ہے ہر چند کہ ہر دو طرف مخصوص نقطۂ نظر کا پروپیگنڈہ کر کے ایک مخصوص طبقہ ذاتی مفادات اور سیاسی کامیابیاں بھی حاصل کرتا رہا ہے تاہم مذہبی اختلافات کے باوجود ہر دو طرف پائے جانے والے لسانی اور تہذیبی و ثقافتی اشتراک کی بدولت دیارِ غیر میں یہ تارکینِ وطن اپنے اپنے علاقوں سے نکلنے کے بعد خود کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرتے ہیں کہ جہاں اُن میں تعلقات اور نقطۂ ہائے نظر کا آزادانہ تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ گویا دیارِ غیر میں اُن کے ہاں اپنائیت کا موہوم سہی مگر ایک رشتہ ضرور موجود رہتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار کا افسانہ ''ناں گندے بچے ناں! رونا نہیں'' اسی تعلق و میل ملاقات کی صورتِ حال کو پیش کرتا ہے کہ جس میں پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے تارکینِ وطن کے پاس ایک دوسرے قریب آنے کے بہت سے بہانے موجود ہیں۔

''سننے کو نوشاد یا ایس ڈی برمن کی موسیقی اور دیکھنے کو فلمیں، بحثنے کو کتابیں، سننے کو ڈھیر ساری باتیں اور رُوٹھنے کے لیے بہت بہانے۔''(۱۱)

جہاں تک ڈاکٹر بلند اقبال کا تعلق ہے تو وہ نامور شاعر حمایت علی شاعر کے صاحبزادے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں، لیکن ایک طویل عرصے سے کینیڈا (ٹورنٹو) میں مقیم ہونے کے باوجود اُن کی کہانیاں شُستہ زبان اور شائستہ اُردو کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ نیز تارکینِ وطن کے مسائل وطرزِ معاشرت کی جھلکیاں بڑے بھرپور انداز میں اُن کے ہاں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

''بے زمینی نسل کشی ہے'' کا متکلم نسوانی کردار ایک طویل عرصہ بے زمینی کا شکار ہونے کو نسل کشی کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک نسل کشی کسی نسل کا وجود محض صفحۂ ہستی سے مِٹا دینا ہی نہیں بلکہ کسی کو اپنی سرزمین سے محروم کر دینا بھی اِسی زُمرے میں آتا ہے۔

''تیس سال چھوٹا عرصہ نہیں ہوتا، ایک نسل جوان ہو جاتی ہے، سو ہو گئی اور ایسی ہوئی جیسی نہیں ہونی چاہیے تھی.....ہم بِنا ماں کے پلے ہوئے بچے ہیں۔ اِسی لیے تو آدھے پکے اور آدھے کچے ہیں۔ ہماری کھاد میں زبان، تہذیب اور تاریخ کے بیج نمونہ پا سکے اِسی لیے تو ہمارے پھولوں میں خوشبو نہیں.....''(۱۲)

اسی طرح بچوں سے دُور تنہائی کا دُکھ اور کرب سہتی ماں کی بھرپور جھلک بُلند اقبال کے ایک اور افسانہ ''ایمپٹی نیسٹ سنڈروم'' (Empty Nest Syndrome) میں دکھائی دیتی ہے کہ جو اپنے بچوں سے دُور تنہائی کا عذاب جھیلتے جھیلتے ماضی کے اُن لمحات میں چلی جاتی ہے جس میں اُسے ہر طرف چہل پہل اور زندگی کا چلن دکھائی دیتا ہے، پانی پینے اور دانہ چُگنے کے بہانے چڑیاں اِردگرد منڈلاتی نظر آتی ہیں اور وہ محض اُن چڑیوں کے لیے ہی صدا لگاتی ہے:

''آ جاؤ میری چڑیوں، دانا کھا لو باوا.....
کائے کو تنگ کر رئیں، بھوکے ہوں گے نا باوا''(۱۳)

اسی طرح جاوید اختر چودھری کے ہاں بھی پاکستانی معاشرے کے ایسے زندہ کردار پائے جاتے ہیں کہ جو اپنے ملک کے معاشی حالات، سیاسی پابندیوں، جاگیرداری نظام کے ستائے ہوئے، ملاؤں کی طرف سے کفر کی حدود میں داخل ہونے والے، فرسودہ رسوم ورواج میں جکڑے ہوئے اور مقتدر طبقے کے ستائے ہوئے سادہ لوح اور عام افراد ہیں جنہیں اپنے معاشرے میں تو ہر جگہ اور ہر لمحہ مسترد کیے جانے کے احساس نے منتشر کر رکھا ہے لیکن آزاد فضا میں سانس لینے اور معاشی بدحالی سے آسودگی کی خواہش کرنے والے یہ عام افراد مسلسل تگ ودَو اور جِدّ وجہد کرتے ہوئے جب یورپ کے سیکولر نظام کا رُخ کرتے ہیں تو اُنہیں وہاں بھی کرب اور عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شکست وریخت اور عدم شناخت کے یہ احساسات انہیں دوہرے کرب کا شکار رکھتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر صفات علوی:

''___ یہ لوگ جب یہاں کے انسانی حقوق کے حمایتی، فرد کی آزادیٔ رائے، سیکولر اور کسی حد تک مادر پدر آزاد معاشرے سے متصادم ہوتے ہیں تو اُن کے استحصال کی راہیں بدل جاتی ہیں اور یہاں سے جاوید اختر چودھری اپنی کہانیوں کا تانا بانا بُنتا ہے___''(۱۴)

اُن کی کہانی ''باشٹر'' ایک ایسے مڈل پاس جے۔وی (جونیئر ورنیکلر) ماسٹر فضل دین کے گرد گھومتی ہے جو اپنے گاؤں میں پیار و محبت اور خلوص نیت سے بچوں کو پڑھاتا ہے لیکن یورپ کے ترقی یافتہ معاشرے کا جُز بننے کی خواہش اُسے بے توقیر کر کے رکھ دیتی ہے۔ کہانی کا تانا بانا ۶۰ء کی دہائی میں (یورپی ممالک کا رُخ کرنے والے اور وہاں کی ترقی سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والے سامان اور دولت کی ریل پیل) میں بُنا گیا ہے جس کو دیکھ کر ماسٹر فضل دین بھی باہر جانے کی ٹھان لیتا ہے، لیکن دیگر تارکینِ وطن کی طرح ماسٹر فضل دین کو بھی پردیس میں بیکاری کے ساتھ ساتھ زبان کی تفہیم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہر چند کہ اُس کے علاقے کے پہلے سے وہاں آباد لوگ اُس کا احترام کرتے ہیں اور اُس سے گھر کا کرایہ بھی نہیں لیتے جس کے بدلے میں ماسٹر فضل دین اُن کو خطوط لکھ دیا کرتا ہے، لیکن اِس کے باوجود ماسٹر فضل دین کو اپنا وطن ترک کرنے اور دیارِ غیر میں بیکار پڑے رہنے کا قلق رہتا ہے اور اِسی لیے وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ:۔

''اللہ جب کسی کو سزا دیتا ہے تو اُسے لات نہیں مارتا بلکہ اُس کی مت مار دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔''(۱۵)

جاوید اختر چودھری نے دو متضاد تہذیبوں کا محض دُور سے مشاہدہ نہیں کیا بلکہ ہر دو میں زندگی بسر کی یہی وجہ ہے کہ یورپ کے صنعتی مزاج اور مقامی تہذیب و تمدن سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و معاشرت اور اُس کے تضادات پر بھی اُن کی گہری نظر ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اِن تضادات کو کبھی تو واقعے یا کہانی کی صورت بیان کرتے ہیں اور کبھی کسی کردار کے افعال و اعمال کی صورت ہم پر انکشافات کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے طویل افسانہ 'ہنر مند' کا فاخر حسین شیرازی ان کا ایک ایسا متکلم کردار ہے جو منٹو کے افسانہ 'نیا قانون' کے منگو کوچوان کی طرح اپنی سواریوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے دیارِ غیر میں مقیم اہلِ وطن کی عادات و اطوار، مقام و مزاج اور اُن کی نفسیاتی اُلجھنوں سے آگہی حاصل کرتا ہے اور انہیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

جاوید اختر چوہدری کی طرح حمیدہ معین رضوی بھی ایک طویل عرصہ سے انگلینڈ میں مقیم ہیں دیگر کئی مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے افسانہ 'کوئلہ بھئی نہ کو___' میں وہ جس اہم اور پیچیدہ صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہیں۔ اُس کی جڑیں بھی بنیادی طور پر معیشت سے جُڑی ہوئی ہیں اور جواب ایک معاشرتی مسئلے کی صورت اختیار کرنے والا نازک معاملہ بن چکا ہے۔ دراصل غربت و افلاس اور معاشی مجبوریوں کے اسیر والدین اب اس بات میں بھی خوشی محسوس

کرتے ہیں کہ ان کی اولاد کے رشتے بیرونِ ملک کمانے والوں سے طے پا جائیں خواہ اس کے نتیجے میں اُن کی ناز و نعم میں پلی بڑھی۔ اولاد کو دیارِ غیر میں اَن گنت مصائب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

تارکینِ وطن کہانی کاروں میں ڈاکٹر خالد سہیل ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے طویل عرصہ سے ٹورنٹو (کینیڈا) میں مقیم ہیں۔ اپنے افسانوں میں شمالی امریکہ میں بسنے والے وہ مہاجرین کو درپیش مسائل (بالخصوص وہاں پلنے بڑھنے والی نوجوان نسل کے حوالے سے) کو وہ بھرپور طریقے سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ خود ایک ماہرِ نفسیات ہیں لہٰذا تارکینِ وطن کی نفسیاتی پیچیدگیوں، تہذیبی و سماجی اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والی جھلاہٹ اور نئی نسل کو اخلاقی و مذہبی حد بندیوں میں قید یا پابند کرنے کی کوشش و خواہش وغیرہ کو بھی وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح دیکھنے، پرکھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مختلف موضوعات کی پیشکش میں مکالماتی انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔

نسلی امتیاز، علاقائی تعصب اور تہذیبوں کے تصادم سے جنم لینے والی پیچیدہ اور گھمبیر صورتِ حال کو ٹورنٹو میں مقیم خالد سہیل اپنے افسانہ 'پاکی' میں بڑی مہارت اور خوبی سے موضوع بناتے ہیں۔ کہانی کا متکلم بتاتا ہے کہ

> ''___ یہ کیفیت جوڑوں میں درد کی طرح تھی جس میں مہینوں جوڑ صحت مند رہتے لیکن جوں ہی فضا میں رطوبت بڑھتی جوڑوں کا درد بھی عود کر آتا۔''(۱۶)

جہاں تک سلطان جمیل نسیم کا تعلق ہے تو اُن کے افسانوی و ادبی سفر کا آغاز اُس وقت ہوا جب افسانہ علامت سے تعلق قطع کر کے دوبارہ کہانی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں 'کھویا ہوا آدمی' سے اپنے افسانوی سفر کا آغاز کرنے والے سلطان جمیل نسیم نے علامتی افسانے کے بجائے بیانیہ افسانے کو ترجیح دی۔ معاشی آسودگی اور خوشحالی کی خواہش میں اپنے قریبی رشتوں اور گھر بار کو چھوڑ کر جانے والے تارکینِ وطن کے احساسِ اجنبیت اور بیگانگی کو وہ اپنے افسانہ ''گھر کا راستہ'' میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ بقول اکرام بریلوی:

> ''سلطان جمیل نسیم اپنے افسانوں میں کسی بندھے ٹکے اُصول و اُسلوب کے پابند نظر نہیں آتے۔ اُن کا اُسلوب موضوع کے ساتھ گھومتا ہے۔ یعنی Spiral ہونے کے بجائے زیادہ تر خط مستقیم (Linear) میں بتدریج آگے بڑھتا اور اختتام کو پہنچتا ہے۔''(۱۷)

ڈاکٹر شیر شاہ سید بھی اپنی کہانیوں میں تارکینِ وطن کے وطن سے دُور بِتائے ایام کا احوال تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''ناسور'' کا متکلم کردار بھی ایک کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے امریکہ میں بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزارتا نظر آتا ہے تاہم اِس کرب کا بھی شکار رہتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں رہ کر اپنے ملک کے مفلس و محتاج اور بے کس و بے بس مریضوں بالخصوص فیسٹولا کا شکار خواتین کا علاج نہیں کر پا رہا تاہم اُن کا افسانہ ''ویل کم ہوم'' اس سے آگے کا ایک قدم دکھائی دیتا ہے جس کی متکلم کردار امریکہ میں آباد ایک پاکستانی عورت ہے اور جسے اپنے پاکستانی ہونے پر ہمیشہ فخر محسوس ہوتا ہے۔

''___ میں ہمیشہ ہی پاکستانی رہنا چاہتی تھی۔ ایک جذبہ تھا میرے دل میں بغیر کسی کشمکش کے۔ غرور تھا اپنے پاسپورٹ پر ہرے بھرے ملک پاکستان کے ہرے جھنڈ یکی طرح ہرا ہرا پاسپورٹ۔''(۱۸)

تاہم زندگی کے دس سال امریکہ میں گزارنے والی اِس متکلم کو جب بیمار باپ کی خبر سن کر پاکستان آنا پڑتا ہے تو پاکستان آنے کے بعد باپ کی وفات سے لے کر امریکہ واپسی تک اُسے پاکستان میں جن مشکل مراحل اور غیر مہذب واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، سب کا سب اُسے بدحواس کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ سڑکوں پر جا بجا ٹریفک کا ہجوم، بیچ سڑک بندر والے کا تماشا، سڑکوں اور ایمبولینس کی خراب صورتِ حال، مہنگا علاج، راہ چلتے چور اُچکّوں کا اسلحے کے بل بوتے پر بیگ چھین لینا، ائیر پورٹ پر امیگرنٹ آفیسر کا فرعونی رعونت آمیز لہجہ، اسپتال کے باہر اُبلتے گٹر کا کثیف پانی، بغیر پانی کے نل، مکان کے کاغذات کی تیاری میں بطور فیس پچاس ہزار کی رشوت، اُن کے فلیٹ پر کرایہ دار کا قبضہ، دُھواں، ٹریفک، ہارن، آوازیں اور شور شرابا وغیرہ دیکھ کر ایک روز تو وہ ٹریفک سے بھرے بندر روڈ پر بے ہوش ہو جاتی ہے اور پھر اگلے ہی دن امریکہ واپسی کا فیصلہ کر لیتی ہے اور امریکہ ائیر پورٹ پر جب وہ امیگریشن کے کاؤنٹر پر پہنچتی ہے تو وہاں بیٹھا موٹا، لمبا اور بھدا سا امریکن اُس کا پاسپورٹ اور گرین کارڈ ہاتھ سے لیتے ہی اُسے مسکرا کر ''ویلکم ہوم'' کہتا ہے اور اُس لمحے اُسے اپنے پاکستانی احساسِ تفاخر میں ایسی ناگوار تلخی محسوس ہوتی ہے کہ جس سے من حیث القوم ہم نے سمجھوتہ کیا ہوا ہے۔

اور پھر ہمیشہ سے پاکستانی شہریت اور پاسپورٹ پر قربان ہونے والی یہ متکلم اگلے ہی روز کام پر جانے سے قبل امریکن قومیت اور پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کروا دیتی ہے۔

صفیہ صدیقی کا افسانہ ''بدلتے زمانے بکھرتے لوگ'' زمانے کی بدلتی اقدار اور ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے والوں کے اخلاقی زوال سے جنم لیتا ہے جس میں تنہائی اور اُداسی کا عذاب گھن کی طرح اولاد سے دُور والدین کو اندر ہی اندر ختم کرتا رہتا ہے ایسے میں کچھ بزرگ تو گھر کی بے جان چیزوں اور در و دیوار سے باتیں کرنے کا فن سیکھ لیتے ہیں جب کہ کچھ اِس صورتِ حال سے گھبرا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں بلکہ کبھی کبھار تو ایسے لوگ زمانۂ حال سے اپنا تعلق منقطع کر کے ماضی کے اُس حصے میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں جو گہما گہمی اور رونق کی بِنا پر اُن کی زندگی کا یادگار وقت رہا ہوتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا اِس افسانے میں مرکزی کردار نعیم کی ماں کو بھی کرنا پڑ رہا ہے جو اپنی اولاد سے دُوری کے سبب خود کو بالکل ویسا ہی تنہا بے یار و مددگار، بے بس اور بے سروساماں سمجھتی ہے جیسا کہ ۴۷ء کے تقسیم و فسادات کے ہنگاموں نے اُسے کر دیا تھا۔ وطن سے دُور امریکہ میں آباد دو اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹوں کی خودغرضی اور لاپرواہی کے ساتھ ساتھ تنہائی کی شکار یہ ماں اِس لحاظ سے بے بس ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ رحم بھی ہے کہ اُس کے بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹوں نے اپنی ترقی اور خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کے سنہرے مستقبل کو بھی اب یورپ و امریکہ کے ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔

اسی طرح فرحت پروین کے افسانے ''جنک یارڈ'' اور ''شاخِ آہو'' بھی امریکہ و یورپ ایسی ترقی یافتہ اقوام کے تہذیبی ماحول کا حصہ بننے والوں کے اخلاقی زوال کا بیان ہیں کہ جس میں مشرقی تہذیب وثقافت کے حامل افراد اپنے خونی رشتوں کو تج دیتے ہیں اور نتیجتاً اس تنہائی واضمحلال کا شکار دکھائی دیتے ہیں کہ جو لاحاصلی کو جنم دیتی ہے۔

''جنک یارڈ'' کا 'شہزاد' عرف 'مُنو' تو اپنی احساسِ کمتری سے جنم لیتے اُلجھاؤں کو دُور کرنے کے لیے جہاں ماں کی پسند کی خوبرو، انگریزی تعلیمی اداروں سے پڑھی لکھی اور متمول گھرانے کی لڑکی کی سنگت میں خوش ہوتا ہے وہاں اُس کی شخصیت اور ترقی یافتہ ماحول کے سحر میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ پھر یہ بات بھی فراموش کر بیٹھتا ہے کہ پانچ بہنوں کے اس اکلوتے بھائی کی تعلیم وتربیت اور پرورش پر اُس کے خاندان نے کس طرح اپنا سب کچھ لُٹا دیا تھا اور ڈاکٹر بنا لینے کے بعد اُس کی امریکہ جانے کی خواہش پر والدین نے اپنے بڑھاپے کے سہارے کے لیے رکھی ہوئی زمین کو بھی بیچ کر کل جمع پونجی اُس کے سامنے رکھ دی تھی لیکن ماں کے مرنے کے بعد متکلم کردار کا ذرا اعتراضِ گناہ ملاحظہ فرمائیں۔

> ''صبح میں ہسپتال جانے سے پہلے تیار ہونے کے بعد سحر کے لاڈلے سلکی کے پین میں ڈاگ فوڈ ڈالتا۔ پھر پیالے میں دودھ اور سیریل ڈال کر تہہ خانے کی سیڑھی کے پہلے قدم پر پیالہ رکھ کر آواز لگاتا۔ ''اماں ناشتہ رکھ دیا ہے، لے لیں۔''(۱۹)

اسی طرح ان کے افسانہ ''شاخِ آہو'' میں اپنی ثقافت سے دور مغربی تہذیب کی پروردہ بیٹی کا باپ سے کیا جانے والا سوال ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''پاپا! اگر ہمیں اپنی ویلیوز اتنی پیاری ہیں تو ہم یہاں کیا لینے آتے ہیں۔ میں آئی سو لیٹ ہو کر کیسے رہ سکتی ہوں۔''(۲۰)

فرحت پروین کی طرح ڈاکٹر کوثر جمال کا شمار بھی اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے تسلسل اور تواتر کے ساتھ تارکینِ وطن کے مسائل اور دیارِ غیر میں گزارے شب و روز کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

جسمانی محنت ومشقت اور ذہنی کوفت سے لے کر اجنبی لب و لہجے، عدم شناخت کے دُکھ، کثیر الثقافتی معاشرے میں نفیِ ذات اور ثقافتی بُعد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شخصی شکست وریخت اور توڑ پھوڑ، تنہائی اور عدم مکالمے کی کیفیت، شہریت کے حصول کے لیے ایجنٹوں اور مقامی لڑکیوں کی دھوکہ دہی ، بلیک میلنگ (Blackmelling) اور ڈی پورٹ کر دیئے جانے کا خوف نیز پیچھے رہ جانے والے افرادِ خاندان کے تقاضے اور خواہشات وغیرہ ایسے کئی موضوعات کہ جو تارکینِ وطن کو دیارِ غیر میں جسمانی وذہنی تکلیف واذیت کا شکار کر دیتے ہیں، ڈاکٹر کوثر جمال کی کہانیوں کا پس منظر و پیش منظر بنتے نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اُن کے چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''میرا اَب ایک معمول بن چکا تھا۔ کارنر شاپ سے چھوٹی موٹی شاپنگ کرنا۔ اخبار

پڑھنا۔ لائبریری جانا۔ شام کو سیر کے لیے باہر نکلنا۔ پوسٹ بکس دن میں کئی بار کھول کر دیکھنا۔ عمارت کے پچھلے احاطے میں الگنی پر کپڑے ڈالنے او راُتارنے جانا۔''(۲۱)

''___ میں اب اس زمانے کی سِڈنی کا تصور کروں تو جابجا ریلوے اسٹیشنوں پر چھوٹے بڑے بیگ اُٹھائے ۱۸ سے ۳۰ سال کی عُمر کے ایشیائی نوجوانوں کی تصویریں نگاہوں میں گھوم جاتی ہیں۔''(۲۲)

بعض اوقات کینیڈا، امریکہ یا یورپی ممالک میں بسنے والے تارکینِ وطن تو کثیر الجہتی ثقافت کے حامل معاشروں میں کلچرل شاک سے بھی دوچار ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی وثقافتی بُعد، مذہبی ومعاشرتی اختلافات اور اِن سے جنم لینے والا تضاد، اپنی زمین یا جڑوں سے دُوری کا احساس، نسلِ نو میں مشرقی ومغربی اقدار کے حوالے سے ردّوقبول کی کیفیت، خدا کے وجود سے انکار اور ماضی پرستی سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ اِن ترقی یافتہ ممالک میں بسنے والے تارکینِ وطن بالخصوص افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں کی خصوصی توجہ کا حامل رہا ہے نیز ان خلیجی ممالک میں بسنے والے تارکینِ وطن کے حوالے سے لکھی گئی کہانیوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ نسلی وقومی تفاخر محض رنگ ونسل کے حوالے سے امتیاز برتنے والی سفید قوموں کا ہی خاصہ نہیں۔ ہم ایسے تیسری دُنیا کے مجبور وبے بس اور غربت وافلاس کے مارے لوگ جہاں بھی پہنچ جائیں اور خواہ ہمارا اُن سے کتنا ہی گہرا مذہبی رشتہ ومطابقت کیوں نہ ہو، ذلّت و ہزیمت کو مقدر کی صورت ہر حال میں برداشت کرنا پڑتا ہے کہ جِسے تارکینِ وطن کو اپنوں کی خوشیوں کے بدلے میں اپنی خودداری واَنا کو کچلتے ہوئے قبول کرنے پر آمادہ ہونا پڑتا ہے۔ محمد حامد سراج کا افسانہ ''شور بہت کرتا تھا'' اسی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔

گویا اس طرح کے افسانوی مطالعے سے تارکینِ وطن کے بنیادی طور پر دو گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں اِن میں سے ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنی زمین، حقیقی رشتوں اور تہذیبی جڑوں سے رشتہ قائم رکھا۔ آبائی تہذیب و معاشرت اور جڑوں سے منسلک و پیوستہ رہنے کی یہ خواہش اُن میں بسا اوقات تو اِس حد تک شدّت اختیار کر گئی کہ ناسٹلجیا کا شکار ہو کر وہ ماضی میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور یا پھر تمام عمر مشرقی ومغربی تہذیب واقدار کے موازنے میں سرگرمِ عمل رہے یہاں تک کہ اُن کے اِس روّیے سے اُن کی نئی نسل تضادات کا شکار ہوگئی اور اُن کے ہاں جھلاہٹ نے جنم لیا کیونکہ اُن کے نزدیک اُن کے والدین کی آبائی زمین اور پاکستانی تہذیب وثقافت اجنبی اور محض دُور کی چیز تھی کہ وہ اُسی زمین اور جگہ کو ہی اہم سمجھتے تھے جہاں وہ پیدا ہوئے، جہاں اُن کی تعلیم وتربیت ہوئی اور دوستیاں قائم ہوئیں تھیں لہٰذا نئی و پرانی نسل کی پسند وناپسند اور تہذیبوں کے اختلاف نے اپنی انتہائی صورت میں اُس تضاد کو بھی جنم دیا جو بعد ازاں تارکینِ وطن کی ایک کثیر تعداد کے لیے ذہنی خلفشار کا سبب بنا۔

جبکہ تارکینِ وطن کی دُوسری قسم میں اپنا وطن ترک کرنے والے تارکینِ وطن نے ترقی یافتہ ممالک کی آزاد

وخود مختار تہذیب و معاشرت اور معیشت سے حاصل ہونے والے بُلند معیارِ زندگی کا اپنے ملک اور اُس کے معیارِ زندگی سے اس طور تقابل شروع کر دیا کہ پھر اپنی تہذیب کو کمتر جانتے ہوئے اُس سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیا یا پھر اُس سے کم از کم بے نیازی کا اس طرح رویہ اختیار کر لیا کہ اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کی بقا اور معاشی استحکام اُنہیں اِسی میں نظر آیا کہ دیارِ غیر میں ہی اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے جائیں۔ لہٰذا ڈالر، پونڈ، دینار اور ریال کو اپنی ملکی کرنسی سے ضربیں دینے والے ان لوگوں نے دیارِ غیر کو ہی اپنا وطن سمجھ لیا یہاں تک کہ اُن کے تمام حقیقی رشتے ایک ایک کر کے اپنی موت آپ مرنے لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تارکینِ وطن کے جس گروہ نے معاشی آسودگی و استحکام کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کے ثبوت میں نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہب و زمین سے تعلق قطع کر لیا اور اپنی شناخت کے ہر اُس حوالے کو بھی ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہے کہ جس سے وہ پسماندہ یا تیسری دُنیا کا حصہ معلوم ہوتے تو مہ و سال کی گردش کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب (۱۱/۹ جیسے واقعات کی بدولت) اُنہیں منہ کی کھانا پڑی۔ اس حوالے سے محمد حمید شاہد کا افسانہ ''گانٹھ'' ایک ایسے ہی شخص یعنی ڈاکٹر توصیف کو موضوع بناتا ہے کہ جو پہلے پہل تو اپنی مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی حد بندیوں کے خلاف اور آزادی کا متمنی دکھائی دیتا ہے نہ صرف یہ بلکہ مذہب و ثقافت کی جکڑ بندیوں سے آزادی کی خواہش ہی اُسے امریکہ ایسے آزاد و خود مختار معاشرے میں بھی لے جاتی ہے کہ اچانک رونما ہونے والا ۱۱/۹ کا واقعہ اُس کی زندگی کو ناخوشگوار موڑ کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر اُسے دُکھ ہوتا ہے کہ وہ تو مکمل طور پر خود کو امریکن سوسائٹی کا حصہ سمجھتا تھا اور اِس قدر خوش اور مطمئن تھا کہ حادثے (۱۱/۹) کے بعد بھی مقامی لوگوں کے ناموافق ردِعمل کے باوجود اپنے فریضے کو انسانیت کی خدمت سمجھ کر ادا کرتا رہا تھا، لیکن اِس کے باوجود خفیہ ایجنسی اُسے دھر لیتی ہے اور اُسے یہ خبر دی جاتی ہے کہ وہ چار دن کے اندر اندر ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ اس اطلاع دینے والے کے حوالے سے کہانی کار لکھتا ہے:

> ''___ اُس نے انگریزی کے اِس مختصر مگر کھردرے جملے سے 'اون کنٹری' کے الفاظ چُن کر غرغرا کیے جانے سے ملتی جلتی آواز کے ساتھ دہرایا۔ ایک تلخ سی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی جس کے باعث اُس کے عصبی ریشوں کی گانٹھوں کی تانت بڑھ گئی اور اُسے پژمردگی رگیدنے لگی۔''(۲۳)

اسی طرح مقصود الٰہی شیخ کا شمار بھی اُردو زبان و ادب سے محبت کرنے والے اُن ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے بیرونِ ملک رہتے ہوئے قومی زبان و ادب کی ترویج میں عملاً حصہ لیا۔ اُن کی افسانوی ادبی خدمات میں دو ناولٹ ''شیشہ ٹوٹ جائے گا''، ''دل اِک بند گلی'' اور افسانوی مجموعے ''برف کے آنسو''، ''پتھر کا جگر''، ''جھوٹ بولتی آنکھیں''، ''من درپن'' اور ''پلوں کے نیچے بہتا پانی'' کے علاوہ مخزن رسالہ بھی شامل ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں میں ترکِ وطن کرنے والی محض ایک نسل نہیں بلکہ ترقی و تبدیلی کی خواہش میں پروان چڑھتی دو تین نسلیں یکجا ہو گئی ہیں، تاہم کہانی کار کا ہُنر یہ ہے کہ وہ مخصوص نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے درس

وتدریس یا وعظ کا رنگ اختیار کیے بغیر بڑے نیچرل انداز میں آگے کی طرف بڑھتا ہے اور کسی بھی صورتحال کی پیشکش میں طویل مکالموں کے بجائے معانی خیز اشاروں پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

جرمنی میں مقیم افسانہ نگار مُنیر الدین کا نام بھی دُنیائے ادب کے افسانوی سرمائے میں کثیر الثقافتی افسانے کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اِسی طرح طویل عرصہ سے انگلستان میں مقیم نجمہ عثمان نے اُردو کی ادبی دُنیا میں بیک وقت شاعری اور فنِ افسانہ نگاری کے جوہر دکھائے۔ اُن کی کہانیاں اور شاعری انڈیا اور پاکستان کے رسائل 'سیپ'، 'اوراق'، 'شاعر'، 'پرواز' اور 'ساحل' وغیرہ میں اکثر اوقات چھپتی رہتی ہیں۔ نجمہ عثمان کی کہانیاں بھی اُن تارکینِ وطن کے مسائل اور طرزِ معاشرت کو موضوع بناتی ہیں جن کی اگلی نسلوں نے مغربی تہذیب و معاشرت میں آنکھ کھولی اور وہیں پل بڑھ کر جوان ہوئی، لیکن مغربی دُنیا میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی مٹی اور آبائی تہذیب وثقافت سے بھی رشتہ اُستوار رکھا۔ بقول صفیہ صدیقی:

> ''نجمہ کی تحریروں میں اپنے معاشرے کے سارے دُکھ درد، سارے رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، خودغرضیاں، منافقت اور عصرِ حاضر میں معاشی ترقی کے باوجود افراد کی بے سکونی ملتی ہے۔''(۲۴)

نیلم احمد بشیر کا شمار بھی اُردو کے افسانوی ادب میں اُن لوگوں میں کیا جاتا ہے کہ جنہوں نے مشرق و مغرب ہر دو طرف بسنے والے ایشیائی کردار و واقعات کو بڑی ہوشمندی سے اپنی کہانیوں میں سمویا۔ وہ اپنی کہانی میں واقعات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کی نفسیات سے آگہی کا بھی مکمل ثبوت دیتی نظر آتی ہیں۔

دراصل نیلم احمد بشیر کا امتیازی وصف ہی یہی ہے کہ وہ تارکینِ وطن کی طرزِ زیست اور مسائل کو بڑی کامیابی اور چابکدستی کے ساتھ مستقلاً اپنے افسانوں کا موضوع بناتی رہتی ہیں۔ تاہم اِس کے علاوہ وہ لوگ بھی اُن کی کہانیوں کا موضوع بنتے ہیں کہ جو معاشی آسودگی اور گھر والوں کی خواہشات و توقعات کی تکمیل کے لیے سرزمین امریکہ پر کسی نہ کسی طرح پہنچنا چاہتے ہیں، تاہم ایسے کرداروں کی پیشکش میں اُن کا لہجہ زہرخند کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اُن کے چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''___ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم ایشین بچوں پر اِس سوسائٹی میں کتنے پریشرز ہوتے ہیں___ اگر ہم کسی کے ساتھ ڈیٹنگ نہ کریں تو ہمیں ابنارمل یا ''گے'' سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر اپنے فرینڈز کی طرح امریکن لائف گزاریں تو آپ لوگوں کی ویلیوز خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ہم اِس سوسائٹی میں رہ کر مِس فٹ نہیں ہونا چاہتے۔''(۲۵)

> ''___ کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے، کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس وٹیکنالوجی کی محبت کو اپنا ایمان بنایا ہوتا تو

آج یوں اپنا دیس چھوڑ کر پردیسوں میں بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوتے۔''(۲۶)

مختصراً درج بالا افسانہ نگاروں کی کہانیوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کی خواہش، بہتر مستقبل اور معاشی خوشحالی کی اُمید یا پھر ازدواجی تعلق میں بندھ کر بیرونِ ملک مستقل سکونت اختیار کرنے والے تارکینِ وطن کو کثیر الثقافتی معاشروں میں شناخت کے بحران، تہذیبی و ثقافتی بُعد اور مذہب سے دُوری کے سبب احساسِ ندامت اور کسک و ملال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیز دوسرے درجے کی شہریت، آبائی رشتوں اور جڑوں سے دُوری کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیبی ماحول کے حامل معاشروں میں تربیت یافتہ نوجوان نسل کا اپنے والدین کی آبائی ثقافت سے جُڑے رہنے سے انکاری ہونا اور دوہری شناخت کے کرب پر جھنجھلاہٹ کا اظہار کرنا وغیرہ بھی ان تارکینِ وطن کو ذہنی انتشار اور خلفشار میں مبتلا کرتا رہا ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال، جاوید اختر چودھری، ڈاکٹر خالد سہیل، محمد حمید شاہد، ڈاکٹر کوثر جمال اور نیلم احمد بشیر کے افسانے انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، تہذیبی و ثقافتی قدروں کی پامالی اور نامعتبری کے اسی احساس کے ساتھ ساتھ ثقافتی بعُد، معاشرتی و تمدنی امتیاز، مختلف تہذیبوں کے تصادم و انجذاب، اقدار و روایات کیکشاکش اور دیارِ غیر میں تارکینِ وطن کی مشکل زندگی کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں جبکہ صفیہ صدیقی، حمیدہ معین رضوی، نجمہ عثمان اور نیلم احمد بشیر کے افسانے پاکستانی معاشرے میں بسنے والے افراد کے بیرونِ ملک لپک کے اُس رویے کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں جن کی بدولت یورپی شہریت کی خواہش کرنے والے یہ تارکینِ وطن غیر اخلاقی حرکات و افعال کے مرتکب ہو کر اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم افتخار نسیم کے افسانوں میں جنسی آزادی کی خواہش کرنے والے تارکینِ وطن یورپ و امریکہ ایسے ترقی یافتہ ممالک میں خوشحال اور آسودہ دکھائی دیتے ہیں اگرچہ اُن کے افسانوں میں بھی اجنبی تہذیب و ثقافت اور تمدنی و معاشرتی ضابطۂ حیات کی بدولت یہ تارکینِ وطن ''کلچرل شاک'' کا شکار نظر آتے ہیں جبکہ سلطان جمیل نسیم کے افسانہ ''گھر کا راستہ'' کا مرکزی کردار بھی گھر والوں کی معاشی آسودگی اور آسائش کی خاطر یورپ میں طویل عرصہ بتانے کے بعد جب گھر لوٹتا ہے تو وہ اپنے اور گھر والوں کے بیچ اجنبیت اور بیگانگی کی ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی دیوار پاتا ہے اور اس اجنبی فضا کے سبب ہی وہ اپنے گھر کا راستہ بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر انوار احمد کے افسانہ ''ناں گندے بچے ناں! رونا نئیں'' کے ہندو مسلم تارکینِ وطن اپنے مخصوص علاقائی تعصّبات و تحفظات کے باوجود بیرونِ ملک میں خود کو ایک دوسرے کی طرف کھنچتا محسوس کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رؤف کلاسرہ: ''آخر کیوں'' (کالم)، مشمولہ، روزنامہ 'دنیا' لاہور، ۱۳/اگست ۲۰۱۴ء۔
۲۔ منیر احمد شیخ: ''بیسویں صدی کی بڑی بڑی ہجرتیں''، مشمولہ ہفت روزہ 'نصرت' (مہاجرین نمبر)، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۷
۳۔ پی ہنٹنگٹن، سموئیل، ''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو''، مترجم: سہیل انجم، آکسفورڈ پرنٹنگ پریس کراچی، ۲۰۰۳، ص ۲۴۵
۴۔ منیر احمد شیخ: ''بیسویں صدی کی بڑی بڑی ہجرتیں''، ص ۲۴۷۔
۵۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔
۶۔ پی ہنٹنگٹن، سموئیل، ''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو''، ص ۲۴۵۔
۷۔ ایضاً، ص ۲۴۷۔
۸۔ جواز جعفری، ڈاکٹر: ''اُردو افسانے کا مغربی دریچہ''، کتب سرائے، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۔
۹۔ ایضاً، ص ۹
۱۰۔ افتخار نسیم: ''شبری''، ہم خیال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۵۹۔
۱۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''آخری خط''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵۔
۱۲۔ بُلند اقبال: ''میری اکیاون کہانیاں''، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۹۶۔
۱۴۔ جاوید اختر چودھری: ''ٹھوکا'' کبری آرٹ پرنٹرز، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۶۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۔
۱۶۔ خالد سہیل: ''خوش قسمت اور پُر اُمید''، مشمولہ ''چند گز کا فاصلہ ۵۷۔
۱۷۔ اکرام بریلوی: ''سلطان جمیل کے افسانے، تجزیہ اور تنقید''، گلوب پبلشرز، کینیڈا، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۔
۱۸۔ شیر شاہ، سید، ڈاکٹر: ''دل ہی تو ہے''، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۸۔
۱۹۔ فرحت پروین، ''جنک یارڈ''، مشمولہ ''تہذیبی تصادم کے افسانے''، مرتبہ: معراج نیر، سید، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۴
۲۰۔ فرحت پروین: ''شاخِ آہو''، مشمولہ ''تہذیبی تصادم کے افسانے''، ص ۱۹۶۔
۲۱۔ کوثر جمال، ڈاکٹر: ''جہانِ دگر''، پورب کا اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۸۹۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔
۲۳۔ محمد حمید شاہد: ''مرگ زار''، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۴۔
۲۴۔ صفیہ صدیقی: ''ملال کی کہانیاں''، مشمولہ ''پیڑ سے بچھڑی شاخ''، ساحل پبلشرز، یو کے، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۔
۲۵۔ نیلم احمد بشیر: ''لے سانس بھی آہستہ'' ص ۱۷۴۔
۲۶۔ نیلم بشیر احمد: ''ایک تھی ملکہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۔